

ضمیریات

مرحوم

سید ضمیر جعفری

”مسدس بد حالی“

سیاست کا ہر پہلو لڑ رہا ہے
یہاں لڑ رہا ہے وہاں لڑ رہا ہے
بیاں لگے مقابل بیاں لڑ رہا ہے
حساب دل دوستان لڑ رہا ہے
ستارہ نظر مہ جبین لڑ رہے ہیں
یہ حد ہے کہ پردہ نشین لڑ رہے ہیں
مزاجوں میں یوں لیڈری آ گئی ہے
کہ گھر گھر کی اپنی الگ پارٹی ہے
کوئی شیر ہے تو کوئی لومڑی ہے
یہی اپی لے دے کے انڈسٹری ہے
نہ منزل نہ جادہ نہ کوئی ارادہ
رضا کار کم یاب لیڈر زیادہ
اگر گھر میں ہیں خیر سے چار بھائی
تو اک اک نے ڈفلی الگ ہے اٹھائی
بچھی ہے سیاست کی پتلی چٹائی
بہ ہر تخت پوش و بہ ہر چارپائی
سلیٹی کوئی، توتیائی ہے کوئی
کوئی سرخ ہے، فاختائی ہے کوئی
جلوس اور جلسے پہ تکرار ان میں
فساد و فتن کے ”نمک خوار“ ان میں

ہا مستقل جوت پزار ان میں
”یونہی چلتی رہتی ہے تلوار ان میں“
جو زندہ مہینا تو مردہ مہینا
یہ کیا زندگی ہے نہ مرنا نہ جینا
ملوں‘ پر مٹوں‘ کارخانوں کے جھڑے
سیاست کے ”نودولتانوں“ کے جھڑے
زبانوں‘ بیانوں‘ ترانوں کے جھڑے
فسانوں‘ ہم داستانوں کے جھڑے
سرخوان لقمہ اٹھانے پہ جھڑا
وہ جھڑا کہ ہر دانے دانے پہ جھڑا
حقائق کے آثار دھندلانے والے
جرائم میں شہ سرخیاں پانے والے
یہ ہر قول دے کر مکر جانے والے
یہ ہر ”میز کرسی“ پہ مر جانے والے
بیاباں کو صحن چمن جانتے ہیں
قیادت کو خوراک تن جانتے ہیں
مکیں گم شدہ ہیں‘ مکاں لڑ رہے ہیں
زمیں چپ مگر آسماں لڑ رہے ہیں
خود اپنی صفوں میں جواں لڑ رہے ہیں
کہاں لڑنے والے‘ کہاں لڑ رہے ہیں
فسادات کی سرخیاں اور بھی ہیں
”مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں“

مقاصد کو زیرو زیر کر کے لڑنا
نتائج سے قطع نظر کر کے لڑنا
شان و تہمتیز کر کے لڑنا
اگر کر کے لڑنا، مگر کر کے لڑنا
کہیں دو ”وڈیرے“ جو لڑ بیٹھتے ہیں
تو سارے ”بیرے“ بگڑ بیٹھتے ہیں
امامت کے تھے مدی خشک و تر میں
سیاست میں دانش میں فکر و نظر میں
مقام ان کا اونچا ہے نوع بشر میں
کہ رہتا ہے اکثر فساد ان کے گھر میں
ہوں کی غلامی شکم کی خدائی
گلا کاٹ دیتا ہے بھائی کا بھائی
مقدر میں بھوک اور گرد سفر ہے
بیرا اگر ہے تو ”فٹ پاتھ“ پر ہے
نہ کھانے کو روٹی نہ رہنے کو گھر ہے
گزر زندگی کا سر رگزر ہے
وہ مردہ پڑا ہے یہ گھائل پڑا ہے
سراہ حل مسائل پڑا ہے
دفاتر کا آئین و دستور رشوت
جہی دست لوگوں سے بھرپور رشوت
وہی بیش توفیق و مقدور رشوت
جوانی پہ ہے ”چشم بد دور“ رشوت

عجب حرص دولت کا یہ رقص و رم ہے
 کہ جیسے ضرورت بہت، وقت کم ہے
 مہاجر کی آبادکاری پہ رشوت
 وساور کی "طینسڈاری" پہ رشوت
 ایکشن کی امیدواری پہ رشوت
 وزارت کی "پروردگاری" پہ رشوت
 جو سائل اصولی، مثالی رہے گا
 وہ بھرپور دنیا میں خالی رہے گا
 مکانوں کی آرائشیں بڑھ گئی ہیں
 کینوں کی آرائشیں بڑھ گئی ہیں
 خیانت کی گنجائشیں بڑھ گئی ہیں
 کہ بیگم کی فرمائشیں بڑھ گئی ہیں
 حدیں کچھ ورائے گماں اور بھی ہیں
 "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"
 امیر اپنے آرام فرمانے والے
 ہر اک ساحل نو پہ رقصانے والے
 مے ناب و برفاب و جمخانے والے
 غریبان ملت سے کٹ جانے والے
 یہ دوری کوئی بے سبب تو نہیں ہے
 محلے کی مسجد، کلب تو نہیں ہے
 یہ رم اور رمی کے بیمار صاحب
 جوئے اور گھڑوڑ کے یار صاحب

سمور اور ریشم کے مینار صاحب
رہاٹ اور روما کے سیار صاحب
وہ شیری دھری ہے یہ وہسکی کھڑی ہے
شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی ہے
نہ یہ کارواں میں نہ یہ کارواں سے
نہ جانے یہ لوگ آ گئے ہیں کہاں سے
جو اپنی زباں میں کہیں کچھ زباں سے
تو بس پھڑ پھڑاتے رہیں رایگاں سے
شملر اور شیلے تو سب جانتے ہیں
مگر میر و غالب کو کب جانتے ہیں؟
زمیں دار کاروں کو دوڑانے والے
زرومال مجروں پہ برسانے والے
کلف دار شملوں کو لہرانے والے
نمک خوار کتوں کو لڑوانے والے
لگاؤ ادب سے ہنر سے نہ فن سے
دھواں اٹھ رہا ہے دل انجمن سے
یہ مانا بشر دیوتا بھی نہیں ہے
یہ جینا نری ایک سزا بھی نہیں ہے
فراغت شے ناروا بھی نہیں ہے
حیات بشر دیرپا بھی نہیں ہے
مگر دین و ملت کا احساس کچھ تو
غریبوں کی ذلت کا احساس کچھ تو

جو جینا ہو تم رہ نمائی کرو تم
جو دانا ہو عقدہ کشائی کرو تم
غنی ہو تو حاجب روائی کرو تم
بڑائی یہی ہے بھلائی کرو تم
بڑے شوق سے اپنے جلے مناؤ
امیرو غریبوں کے بھی کام آؤ
تمنا کہ ہر شے کی تجدید کچے
تمنا کہ کروں کو خورشید کچے
عمل سے نہ جذبے کی تائید کچے
بیاں دیجیے اور تردید کچے
طلب یہ کہ دینم میں اونچی ہو ”نیشن“
عمل یہ کہ جلے میں اک ”ریزولیشن“
نہ منشور اپنا نہ دستور اپنا
قدم راہ چلنے سے معذور اپنا
مگر شور ہے دور سے دور اپنا
گلا کام کرتا ہے بھرپور اپنا

مردِ مومن

(رُوحِ اقبال سے ندامت کے ساتھ)

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن --- نئی شان“
تولا کبھی ماشہ --- کبھی سنگھڑ کبھی کاغان
بُت خانہ میں اک ایک کو تھا دعویٰ ایمان
کعبہ جو بنایا تو نہیں کوئی مسلمان
سہا ہوا --- ڈبکا ہوا --- حیران، پشیمان
جیسے کسی کنجوں کے گھر میں کوئی مہمان
کرسی پہ ہے مومن کبھی مومن پہ ہے کرسی
ایوان کی زینت کبھی رُسوا سر میدان

سید، کوئی مرزا، کوئی راجہ، کوئی راؤ
لاؤ ذرا دیکھوں تو کوئی صرف مسلمان
مُلا ہے تو اِس کاٹھ کا مُلا ہے کہ الحق
حیران ہے اسلام تو قرآن --- پریشان
افسر ہے تو اس ٹھاٹھ کا افسر ہے کہ جیسے
اک چیز ہے بالا تر نسلِ بنی انسان
تاجر ہے تو اِس جونجھ کا تاجر ہے کہ اکثر
ایمان کو بھی تول کے رکھ دے سر میزان
مُفتی ہے تو تکفیر سے پُھوٹی ہوئی نکسیر
شاعر ہے تو بس عذرا و سہلی کا حدی خوان

لیڈر ہے تو اس شور کا لیڈر ہے کہ گویا
مأمور مَن اللہ ہے وزارت پہ یہ طوفان
دل اس کا ہے پنجابی و بنگالی و سندھی
گھر اس کا بخارا نہ سمرقند نہ ملتان
”سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ“
لو دست و گریبان ہے سُبْحان سے رمضان
وحشت تو فرنگی مدینت سے مسلم
گھر آنے کی توفیق نہ ارمان نہ سامان
میری و وزیری و سفیری و اسیری
یہ ”چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان“



نظر کی عیب جوئی دل کی ویرانی نہیں جاتی
یہ دو صدیوں کی عادت ہے بد آسانی نہیں جاتی
مسلمانوں کے سر پر خواہ ٹوپی ہو نہ ہو، لیکن
مسلمانوں کے سر سے بوئے سلطانی نہیں جاتی
یہ اچھی فقر و استغنا کی صورت ہے معاذ اللہ
کہ پوری قوم کی صورت ہی پہچانی نہیں جاتی
”خداوند یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں“
کہ پیدا ہو گئے ہیں اور خیرانی نہیں جاتی
جہاں تک کثرتِ اولاد نے پہنچا دیا اس کو
وہاں تک بندہ پرور نسلِ انسانی نہیں جاتی
یہی جمہوریت کی مغربی معراج ہے شاید
کہ اب ہم سے خدا کی بات بھی مانی نہیں جاتی
مجرد آرٹ کی شہکار عورت بھی عجب شے ہے
جو اس کو دیکھ لو پہروں پشیمانی نہیں جاتی

سڑک چل رہی ہے

ہر قدم کی اپنی اپنی چال ہے
آدمی کو صبح کا ٹوٹا ہوا بال ہے
خستہ و برگشتہ و بد حال ہے
یہ ہماری پیاری اصغر مال ہے
چہرہ بنگلوں کا بظاہر لال ہے
بچے دیکھو تو پتلا حال ہے
اپنے اپنے پتھروں کی جھیل ہے
اپنی اپنی مکھویں کا ٹال ہے
بھگنیں اس پر بچھا جاتی ہیں روز
جس کے گھر میں جتنا جتنا مال ہے
گھر کی ہر نالی بتا دیتی ہے روز
آج گھر میں گوشت ہے یا دال ہے
زید کی دہلیز پر جو چیز تھی
یہ جگر کا ”نامہ اعمال“ ہے
ترگڑھوں کا اک علی گڑھ ہر طرف
ہر گڑھا تاریخ ماہ و سال ہے
آدمی سے بڑھ کے اصغر مال پر
بھینس کا گوہر بلند اقبال ہے

پرنس گل اندام

(ملتان سے محبی ایس عثمان کی طرف سے آموں کے تحفے پر)

آم جو میرے نام بھیجے ہیں
کتنے شیریں پیام بھیجے ہیں
لطف و لذت کے صبح و شام آئے
آم آئے کہ مے کے جام آئے
جشن برپا ہے خاص آموں کا
رنگ نکھرا ہمارے شاموں کا
دن کو گھر میں سرود کا میلا
شب کو اول پہ موج کا میلا
کیف جس سے اُمنگ پیدا ہو
رنگ جس سے ترنگ پیدا ہو
مہ و شوں کو کھلا کے کھائے ہیں
چاندنی میں ملا کے کھائے ہیں
قد میں یہ سبج مٹھاس کہاں؟
شہد میں یہ کنول کی باس کہاں؟
ان کی خوشبو، سر نسیم بہار
مہک اُٹھا ہے خطہ پوٹھوہار
آم اور برشگال کفی راتیں
آم اور حُسن یار کی باتیں
اُو اے دوستو کہ میرے پاس

سوم رس کے ہیں سر بہ مہر گلاس
 گدگدے، شوخ، کجگاہ یہ آم
 سارے آموں کے بادشاہ یہ آم
 ہوں گے اس شے کے شائق و طالب
 باغ رضوان میں حضرت غالب
 شال دھانی بھی زعفرانی بھی
 کیف بھی، حُسن بھی، جوانی بھی
 خواہ شخصی ہیں، خواہ پیوندی
 ہمہ لذت، تمام خورسندی
 گٹھلیاں، چشم مرغ و ماہی ہیں
 آم کی سرسری گواہی ہیں
 جسم نازک میں کوئی تار نہیں
 تار ہے بھی تو خاردار نہیں
 چُھب منوہر ہے، شکل پیاری ہے
 کشت کاری میں دستکاری ہے
 رُوئے رنگیں پہ تازگی کی پھبن
 جان شیریں میں اک سنہرا پن
 تن پہ باریک، دل نشیں جھلکا
 جیسے ریشم ”ولایتی“ مل کا
 کوئی ممتاز خانوادہ ہے
 جو بھی دانہ ہے شاہزادہ ہے
 جانے کس نام سے ہیں یہ بدنام

میں کہو گا — ”پرنس گل اندام“

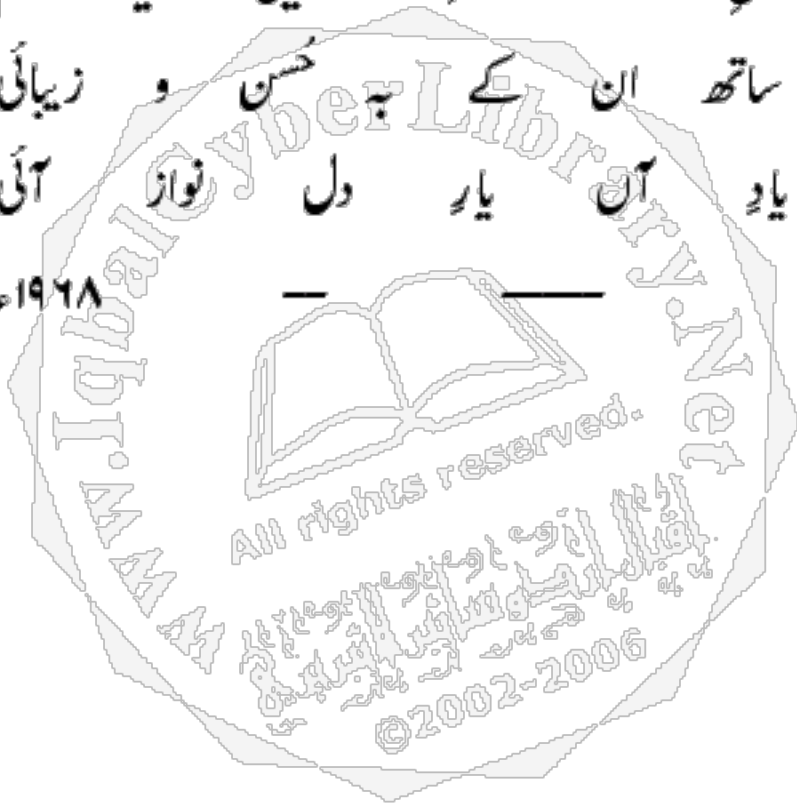
نازشِ رودِ سندھ ہیں یہ آم

فاتحِ ملکِ ہند ہیں یہ آم

ساتھ ان کے بہِ حُسن و زیبائی

یادِ آنِ یارِ دل نوازِ آئی

۱۹۶۸ء



پرائی موٹر کا چسکا

منفرد مزاح نگار نذیر احمد شیخ کی نذر جن کی موٹر ایک عرصے تک یاروں
کی سواری کے لیے وقف رہی۔

دوست بدظن ہیں کہ اُن سے بدگماں رہتا ہوں میں
ماہ و مہر و مشتری کے درمیاں رہتا ہوں میں
کیا بتاؤں دوستوں کو اب کہاں رہتا ہوں میں
شیخ کو شب رنگ موٹر میں رواں رہتا ہوں میں
دوستوں سے ترک ربط دوستانہ ہو گیا
ہوتے ہوتے میں ضمیر غائبانہ ہو گیا

میں یہ کہتا ہوں کہ مصری خان ہو گا ٹال پر
وہ یہ کہتا ہے میاں اقبال ہو گا مال پر
میں یہ کہتا ہوں کہ چل مرغابیوں کے تال پر
وہ یہ کہتا ہے کہ لہرا دیکھیے ”فٹ بال“ پر
میں یہ کہتا ہوں سفارش کے لیے تھانے کو چل
وہ یہ کہتا ہے کہ خارش ہے شفا خانے کو چل
میں یہ کہتا ہوں کہ راول کی طرف لے چل مجھے
وہ لیے جاتا ہے سوئے مشہد و موصل مجھے
میں یہ کہتا ہوں ذرا فطرت کے دو اک پل مجھے
وہ یہ کہتا ہے محمد خان ہے افضل مجھے
کیا کروں حالات کو اوقات پر قابو نہیں
اندریں حالات اپنی ذات پر قابو نہیں

جب سے ارزاں ہو گئی یہ ”کار“ بے دام و درم
کوچہ و بازار میں چلنے سے گھٹ جاتا ہے دم
سِل انبوہ بشر؟ کوچے میں دریا ، کو میں یم
ران پر ٹھیلے کا پیا ، کان پر تانگے کا بم
گھر سے تو اکثر بہ قصد دوستاں آتا ہوں میں
پھر جدھر موٹر چلی جائے چلا جاتا ہوں میں
دو قدم چلنا ہوا دشوار یارو کیا کروں
حوصلہ کم فاصلہ بسیار کیا کروں
بن گئی رفتار ہی دیوار یارو کیا کروں
وہ بھی ہیں میری طرح شاید اسی اوبار میں
پرہ رہی ہیں آج جو قومیں ”پرائی کار“ میں

۱۹۵۸ء.....

کر دیا اس کار نے بے کار، یا رو کیا کروں



غنیمت ہے تری خوش چہرگی اور سادگی اپنی
کہ ان چیزوں سے رہتی ہے طبیعتِ روغنی اپنی

زراہِ دل نوازی ہے برہمن دوستی اپنی
سیاست میں نہیں کوئی وصیت آ کر اپنی

عبوری دور میں اس طرح گزری زندگی اپنی
نہ محکمِ ممبری اپنی، نہ پکی نوکری اپنی

پریشان ہی نہ کر دے وحدتِ ملی کا شیرازہ
خدا کے گھر کی دیواروں میں یہ صورتِ گری اپنی

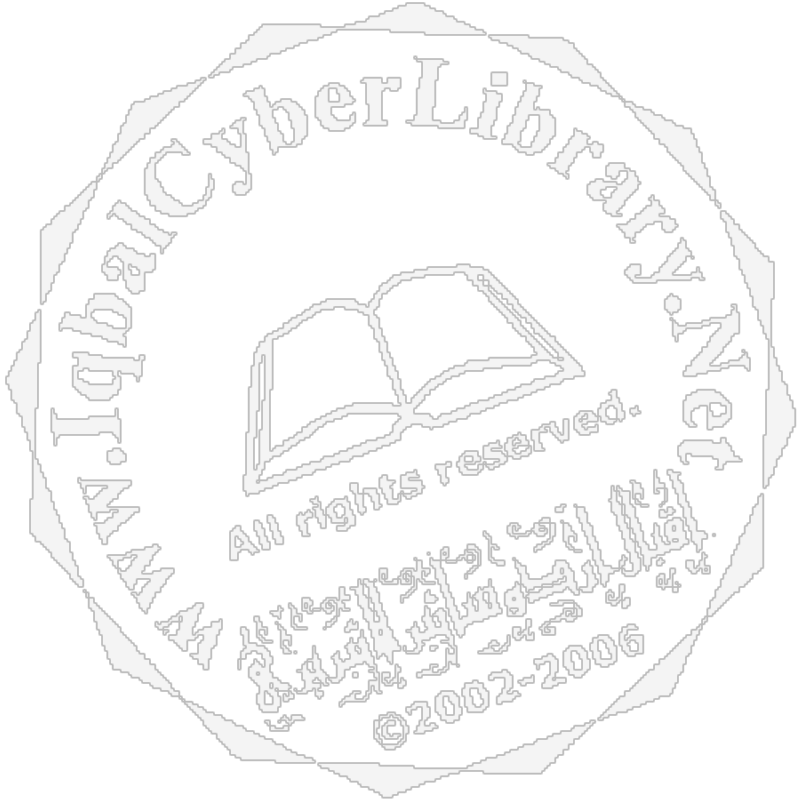
ادھر مُرخانِ صنعتِ بانگِ دنیا بھر میں دے آئے
ادھر انڈوں سے نکلی ہی نہیں ”انڈسٹری“ اپنی

ہماری کشتِ پُرِخم تھی مگردو چار قسطوں میں
غٹاؤٹ پی گئے ہم آپ ہی ساری نمی اپنی

مجھے وہ گمِ ضمِ اکِ خطِ ناکشیدہ فلسفی سمجھے
چلو اچھا ہوا، کام آگئی آوارگی اپنی

ضمیران سے سخن اپنی زباں میں کر نہیں سکتے
بیانِ حالِ دل کیا ہو، نہ ”کا“ اپنا نہ ”کی“ اپنی

۱۹۸۲ء



معذرت نامہ

مجی مولوی محمد سعید، ایڈیٹر روزنامہ ”پاکستان ٹائمز“ راولپنڈی کے

فرزند کی شادی کے دعوت نامے کے جواب میں

سعید محترم نے اب کے اتوار
رچایا مجھے بیٹے کا ولیمہ
مجھے بھی یاد فرمایا انہوں نے
زراہ لطف اخلاقی قدیمہ
بہت جی چاہتا تھا حاضری کو
پاس ربط اخلاص قدیمہ
لہک کر شعر پڑھتے اور کھاتے
پلاؤ۔ قورمہ، مرغاب و قیمہ،
سفر سرآمد آیا کوئے کا
اسی دن اور بہ خط مستقیمہ
مبارک ہوں انہیں بچوں کی خوشیاں
دعا نکلی یہ از قلب صمیمہ

۱۹۶۸ء

فورٹ منرو

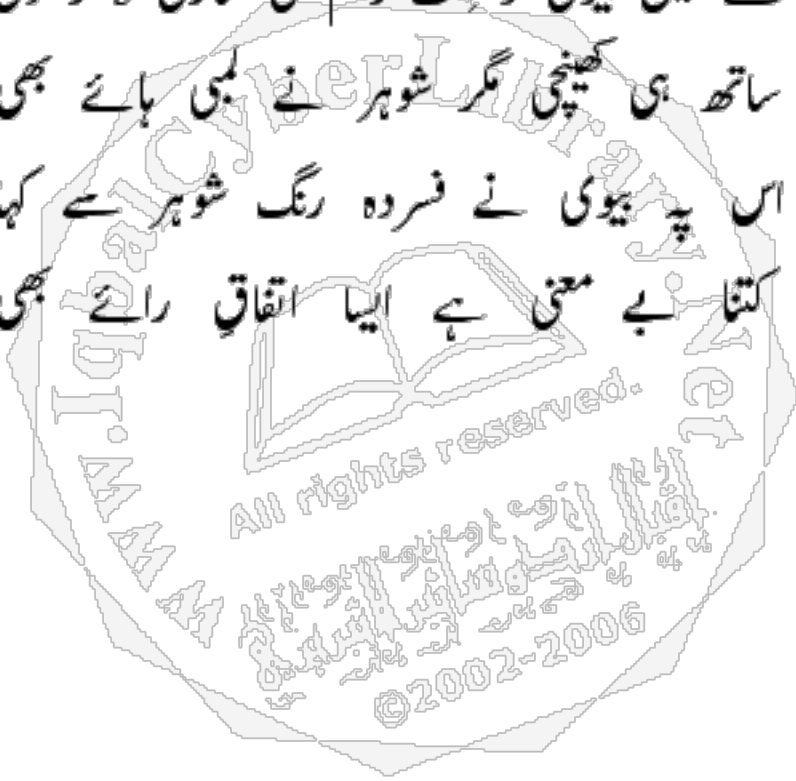
صدیوں کی یہ ویرانی، یہ ریگ بیا بانی
میلوں میں نہیں دانہ، کوسوں میں نہیں پانی
قطرت کے ”مقابر“ کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مردِ گہستانی

All rights reserved.

©2002-2006

اتفاقِ رائے

تختے میں بیوی کو اک ریشم کی ساری لا تو دی
ساتھ ہی کھینچی مگر شوہر نے لمبی ہائے بھی
اس پر بیوی نے فردہ رنگ شوہر سے کہا
کتنا بے معنی ہے ایسا اتفاقِ رائے بھی



انزام

پولیس کے ایک سپاہی نے
اک شخص کو جب ماخوذ کیا
تو اس کو یہ انزام دیا
تراجم ہے یہ
اے شخص تو رشوت دینے میں ناکام رہا



دفتر نامہ

منشی و مہدی و اورنگ و افسر دیکھیے
دو تہائی۔ نصف، چوتھائی ستر دیکھیے
اپنی آنکھوں سے بھی خود اپنا منظر دیکھیے
دور جا کر دیکھیے۔ نزدیک آ کر دیکھیے
لوگ باہر دیکھیے، اور لوگ اندر دیکھیے
اک بڑی سرکار کے دفتر کا منظر دیکھیے
کوئی بیٹا لائے ہے، کوئی بھتیجا لائے ہے
کوئی پرمٹ کے کسی چکر میں چکر کھائے ہے
صورتِ شام و سحر اک آئے ہے اک جائے ہے
”مژدہ اے جوشِ جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے“
اک ہجوم ووٹراں، لشکر بہ لشکر دیکھیے
اک بڑی سرکار کے دفتر کا منظر دیکھیے
جس قدر افسر نگاہِ معدلت گستر میں ہیں
حضرت ابنِ بطوطا کی طرح چکر میں ہیں
مصر میں، ایران میں، لبنان میں بربریں ہیں
بعض پیدائش سے ”یو این او“ کے گھنٹا گھر میں ہیں
ان کے کالر، ان کے جھالر، ان کے ڈالر دیکھیے
اک بڑی سرکار کے دفتر کا منظر دیکھیے
”فائلیں“ آتی ہیں، مر جاتی ہیں اندر ہی کہیں
کھا گئی ہے کتنے منصوبوں کو دفتر کی زمیں
اس کا شکوہ بے محل ہے اے زبانِ نکتہ چیں

”پالیسی“ ہی اپنی ”درآمد“ ہے ”برآمد“ نہیں
اپنے تخمینے ذرا نمبر بہ نمبر دیکھیے
اک بڑی سرکار کے دفتر کا منظر دیکھیے
ہیں یہاں ایسے بھی کچھ مبروص فطرت کے بشر
”چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر“
نہند آتی ہی نہیں رشوت کی دھن میں رات بھر
یہ جہلت دیکھ کر یہ قتل ملت دیکھ کر
پھر جہیں پر مسجد و محراب و منبر دیکھیے
اک بڑی سرکار کے دفتر کا منظر دیکھیے

خودی

پیہم سنتے ہیں یہ پند
خودی بلند - خودی بلند
ہم ہے اہم غلم لوگ
بہس میں بے بس
ریں میں بند
خودی کہاں ہے کریں
بلند؟

All rights reserved.

©2002-2006

عبادت

گھٹنوں گر کر - معبر میں

حمد ترانے گاتے جاؤ

خلق و تپاک سے بچتے بچتے

کچھ بارود بچاتے جاؤ



قبر کتبے

(۱)

ایک شاعر ہے یہاں مصروف خواب
جس پہ تھے اسرا قدر بے حجاب
آستیں میں ماہتاب و آفتاب
اس نے اپنے ذہن سے

اک خدا کی ذات سے قطع نظر
ہر کسی پر برملا تنقید کی
بے انتہا تنقید کی

حضرت یزداں بھی محض
انفاتاً بیچ گئے
کیوں کہ ربِ دوسرا سے آپ کی
صاحب سلامت ہی نہ تھی
واقفیت ہی نہ تھی

یہ ہے نزلے جیک کی قبر
 کندہ جس پر آیہ صبر
 جسمنا نازک ہزم
 قسما ، قولاً بڑا
 ڈربا کے بازاروں میں
 جوتے پالش کرتا تھا
 لوگ ہوتے ریٹائر
 بھر گیا ”ڈربا“ شاعر
 مہنگے ہو گئے ”مار“ جب
 گونگے ہو گئے شاعر جب
 نزلے گنجے پنشنروں کے سر کی مالش کرتا تھا
 اب بھی گویا ایک طرح کے جوتے پالش کرتا تھا
 (انگریزی سے)..... ۱۵ اگست ۱۹۸۲ء

بسلسلہ سلسلہ

اسلام آباد کی محدو ادبی انجمن ”سلسلہ“ کی تیسری سالگرہ پر... ممتاز
شاعرہ محترمہ آداجعفری اس کی بانی تھیں اور محترم قدرت اللہ شہاب

صدر

قورے پر قلم آزمائی ہوئی
اس بہانے مگر خوش نوائی ہوئی
چند جگہ تو شب میں چمکتے رہے
شام احباب کچھ تو حنائی ہوئی
اک برس سلسلہ اور چلتا رہا
سوچے تو بڑی کاروائی ہوئی
غیبت و جگ ہنسائی کے ماحول میں
کیا یہ کم ہے یہاں..... گھر ہنسائی ہوئی

۱۹۸۲ء

.....۲۸ جنوری

علمی چوکے چھکے

میں نے ثابت کر دیا ہر طور ہر آئین سے
آئی تھی اردو زباں کابل کے رستے چین سے
کوئی پورس ہی سکندر کے فسانے میں نہیں
اس سے پہلے ہو تو ہو اس کے زمانے میں نہیں

قصہ فردوسی و محمود بھی یکسر غلط
 بلکہ فردوسی کی ہست و بود بھی یکسر غلط
 چھپ گیا ہے جو کلام خوب اس کے نام سے
 وہ اڑایا اس نے اک ”تجانی المرغام“ سے
 میں نے یہ ثابت کیا جہلم کے قرستان سے
 آریا برما سے آئے اور ہن جاپان سے
 وہ نیا پتھر جو کلا ہے پرانے عار سے
 کتنی تہذیبوں کو دے مارے گا اپنی مار سے
 ۱۹۵۰ء

قول و عمل

قول و عمل کا ربط ہے محکم
 آج نہ بدلا اپنا آج ، اگر تو نے
 تیرا کل تبدیل نہ ہو گا
 قدرت کا دستور اٹل ہے
 سچ کا پھل تبدیل نہ ہو گا

لاس اینجلس (امریکہ).....(جرمن ادب سے ماخوذ)

۱۹ اگست ۱۹۸۱ء

موازنہ

کے کتے کی عاتقوں کو
جب بھی بغور دیکھا
تو ہو گیا ہوں
انسان کی برتری کا
لیکن جناب عالی
انسان کی خصلتوں کو جب بھی بغور دیکھا
شرمندہ ہوا ہو گیا ہوں

نیوجرسی۔ امریکہ..... (ازرا پاؤنڈ سے ماخوذ)

۲۲ اگست ۱۹۸۱ء

ہاں اور نہیں

[امریکی طنز نگار اوڈگن ناش کی نظم "YES AND NO" کا عکس]

کاش میں ہوتا سیاسی کارکن
ابتداء میں کارکن
بعد میں..... دو چار ہڑتالوں کے بعد
افسروں کے ساتھ پڑتا لوں کے بعد
فرد سے جلیل
اک زعیم خوش لباس خوش کلام
کا گھر میں صبح..... مے خانے میں شام
قصر ابیض، میں سہ پہری نقل خاص
صدر امریکہ کا کے ساتھ
گردن مینا پہ ہاتھ
ناشتہ بھی گاہ گاہ

واہ واہ

چین کے منقوش آئینوں کے بیندہ گلاس
مانجر کے زرد امروہوں کی ساس
گردشِ عالم کے ساتھ
گردشِ آدم کے ساتھ
کتنا خوش..... کس قدر آسودہ حال
مقتدر..... فرخندہ
خاطر..... ہامراد
مگر!
اگر!

تجھ کو ہوتا کاش اپنے آپ پر کچھ اعتماد

(نیویارک).....۶ ستمبر ۱۹۸۱ء



نسخہ

نوازش، پرشِ صحت کا یارو
ابھی مضبوط ہے اپنا ارادہ
نسخہ تندرستی کا سادہ
مشقت کم مگر سونا زیادہ
صبح دم ہوا یہی منظر
مدتوں سے ہوتا ہے
بابا جان کھاتے ہیں
پیٹا رام سوتا ہے

قومی لباس

افرنگیوں کے جاکٹ و پتلون و جین میں
عبدالودود کا ہے کو عبدالودود تھا
ڈھانپا اب ”اچکنوں“ نے عیوب برہنگی
”ورنہ وہ ہر لباس میں نگا وجود تھا“

۱۹۸۱ء.....



دوستوں آئیے کام کوئی کریں
کچھ نہیں اور تو عیب جوئی کریں

ہمارے مسائل کو آسان کر
برزخ کو یارب مسلمان کر

کون ہے پکا جیون کی
گنجے پنشنروں کی گنگھی



اک شیر سے ہمارے بھی دو ہاتھ ہو گئے
انجام یہ ہوا ہے کہ اک ہاتھ رہ گیا

ایک ڈپٹی کمشنر کی ڈائری سے

آج چھیڑی ہی تھی اک بوجھل سی بوسیدہ اپیل
پل رہے ہیں جس کی رزاقی پہ دو موٹے وکیل
آگیا اتنے میں اوپر سے بڑا ارجنٹ تار
جس میں لکھا تھا کہ ”اے ڈپٹی کمشنر ہوشیار“
دو وزیران گرامی آ رہے ہیں دفعتاً
تم پہ لازم ہے ابھی روشن کرو دشت و دمن
ساتھ ان کے شین بھی ہے، جیم بھی ہے، میم بھی
غیر ملکی ماہروں کی گشت والی ٹیم بھی
کیجیے ان کے قیام محتشم کا اہتمام
دور تک ہوشامیانوں کا محلہ انتظام
طبع نازک بھی نصیب دشمنان ناخوب ہے
آج کل یخنی پرندوں کی فقط مرغوب ہے
بہر عرض شوق جتنے بھی ’وڈیرے‘ آئیں گے
یہ وڈیرے اپنے ڈیرے سے بیڑے لائیں گے
مسجد جامع میں پڑھوانی ہے اک پبلک نماز
لیکن اپنی اپنی صف میں ہوں گے محمود و ایاز
پیر صاحب سے بھی رسم و راہ پیدا کیجیے
جس طرح بھی ہو کوئی درگاہ پیدا کیجیے
خوش عقیدہ ’ووٹروں‘ میں نیک نامی کے لیے
نوگزے کی قبر سج جائے سلامی کے لیے

کم سے کم چالیس گھوڑے بھی فراہم کیجیے
اس علاقے میں اگرچہ کم ہیں تاہم کیجیے
کام یہ ہے قوم کو پیغام دینے آئیں گے
ایک نیلی گائے کو انعام دینے آئیں گے

پاکے اس معقول و مربوط و منفصل تار کو
میں نے پھر بندھوا دیا فائل کے اس انبار کو
741 کو میل لائن، ملیر چھاؤنی 1983ء

All rights reserved
©2002-2006

ہم آزاد ہیں

فرد ہو یا ملک تنہائی کا یارا بھی نہیں
بھائی چارے کے بہ جز کچھ اور چارہ بھی نہیں
ہم نے یہ مانا اکیلے میں گزارا بھی نہیں
بات ہو جائے کسی سے یہ گوارا بھی نہیں
ہم عجب آزاد ہیں ہم کس قدر آزاد ہیں
ہم زمانے سے بہ اندازِ دگر آزاد ہیں
آج کل دنیا سمٹ کر ایک کاخ و کو میں ہے
اک قدم لاہور میں ہے ایک ٹمبکٹو میں ہے
ہم شکاگو میں دھمک سارے ہنولو لو میں ہے
لالہ مصری خان لیکن اپنی ہاؤ ہو میں ہے
وہ یہ کہتا ہے کہ ہم مردانِ نر، آزاد ہیں
ہم زمانے سے بہ اندازِ دگر آزاد ہیں
آئیے اب گھر میں آزادی کا منظر دیکھیے
جزبہ جز بکھرا ہوا، دفتر کا دفتر دیکھیے
اپنی صورت اپنے آئینے کے اندر دیکھیے
شرم آئے گی مگر جانِ برادر دیکھیے
ہم تو آزادی سے بھی کچھ بیش تر آزاد ہیں
ہم زمانے سے بہ اندازِ دگر آزاد ہیں
خوابِ آزادی کی یہ تعبیر سمجھے ہیں ضمیر
یار ماری چور بازی سمگلنگ، دار و گیر
گھات میں بیٹھا ہوا ہے کیا پیادہ، کیا وزیر

اپنا اپنا کوہکن ہے اپنی اپنی جوئے شیر
بے نیاز امتیاز خیر و شر آزاد ہیں
ہم زمانے سے بہ انداز دگر آزاد ہیں

152 میکسن روڈ، راولپنڈی..... 28 اکتوبر 1958



میں رکھوالا

میں رکھوالا
اوچی لبی کلنی والا
امن کا بھی قانون کا بھی
انگریزی پتلون کا شاہ
انگلستان کا تاج و تخت
اس کے تاج و تخت
میرا لوگوں کا دھن
تخت پہ جو بھی راج کرے
بندہ اپنا کاج کرے
پر جا بھری کچھری میں
کھرکی دار کٹھری میں
اجلا صاف لبادہ ہو
علم سے ٹھاٹھ زیادہ ہو
کلکتے سے لاٹ آئے
دو گھوڑے کی لمبی چوڑی چکنی بمبو کاٹ آئے
باتیں فرفر کرتا ہے۔ ”لیس سر۔ لیس سر“ کرتا ہے

(بگ ہولڈن سے ماخوذ)..... 1953ء

ڈاکٹر کا نسخہ

ڈاکٹر نے اک مریض سے کہا
غسل آب صاف روزانہ کرو
پیرہن اجلا رہے
صبح کو تازہ ہوا کھایا کرو
بیوی نے گھر آ کے شوہر سے کہا
ڈاکٹر کہتا ہے رم جھم سادیاں پہنا کرو
بازوؤں کو پور تک گھنا کرو
سردیوں میں ایک لمبا پرسکون بحری سفر
بحرا وقیانوس کے بانگے جہاز خاص پر
گرمیوں میں 'سیرگاہ برف' میں جایا کرو
اور جب
لوٹ کر آیا کرو
نبض دکھایا کرو

فندق الفلج - مسقط (انگریزی سے ماخوذ)

21 اگست 1984ء

جشن مسند نشینی

(بنگال کے گورنر سر ولیم گرے (FREY) کی ڈیوڑھی میں لٹکانے

کے لیے)

تیری مسند کا دن آگیا
سب سلامی کریں
دھوم دھامی کریں
نیک نامی کریں
ہوں ضیافت کی پر جوش تیاریاں
دعوتیں پیاریاں
کام یاریاں
ہم اکٹھی کریں شہرو دیہات سے
نرم تن بکریاں
مرغ ماہی کی سالم کڑا ہی چلے
تاکہ تیری نمائش فروزاں رہے
تاکہ اپنی ستائش کا ساماں رہے
کار مشکل کریں بھی تو آساں رہے
یہ نہ سوچا کبھی
ان غریبوں..... غلیظوں..... مریضوں کے
تاریک ماحول میں
’تاج زر‘ جگمگانے سے کیا فائدہ!
جشن عشرت منانے سے کیا فائدہ!

(سیل ریڈن)..... 1867ء



آگ جب تک جلے نہ جانوں میں
آج ڈھلے نہیں ترانوں میں

وعدہ یار جاں فزا ہے۔ مگر
پھول کھلتے نہیں چٹانوں میں

خواب کے نرم تار کیا ٹوٹے
تیر بھی مڑ گئے کمانوں میں

آدمی بھی تو کیڑیوں کی طرح
بٹ گئے تنگ تنگ خاتون میں

نسل نو کو سدھار نے کے لیے
مدرسے کھل گئے ہیں تھانوں میں

لوگ اب یوں گھروں میں رہتے ہیں
جس طرح بوتلیں دکانوں میں

پیر صاحب کی گفتگو سن لی
کچھ زمینوں ، کچھ آسمانوں میں

دوستوں کی منافقت جیسے
کوکو کولا..... شراب خانوں میں

ہم نے دیکھا ضمیر صاحب کو
سرکشیدہ تھے درمیانوں میں



سہیلی بوجھ پہیلی

اگر پھر کبھی وہ ترے پاس آئے
انگوٹھا اٹھا کر..... انگوٹھی بٹھائے
نہ کھائے نہ گائے
نہ تجھ کو ہلائے نہ خود کسمائے
کسی ملک کی اجنبی ریختہ میں
نگاہوں سے تم اس کا قد ناپ لینا
اگر قامت یار چھ فٹ سے کم ہو
تو پیاری سہیلی اسے ہاں نہ کہنا
کنواری ہی رہنا!

اگر ہونٹ اس کے گلابی نہیں ہیں
غرض مند آنکھیں شرابی نہیں ہیں!
نظر میں سندیے جوانی نہیں ہیں!
ارادوں کے رخ نیم خوابی نہیں ہیں!
نہیں ہاتھ اگر اس کے اجلے اچھوتے
کہ جیسے

نئی برف ہو اپنی کہ مری میں
ملاحٹ نہیں، خوش بیانی نہیں ہے!

صباحت کی چھب بھی سہانی نہیں ہے!
حمل گلے کی پرانی نہیں ہے!
بزرگوں کی کوئی نشانی نہیں ہے!
تفکر تو ہے، ترسائی نہیں ہے!
نظر میں شفق آسانی نہیں ہے!
بھرے بازوؤں میں گرانی نہیں ہے!
کسی کام کی وہ جوانی نہیں ہے
تو پیاری سہیلی اسے ہاں نہ کہنا

کنواری ہی رہنا!

اگر ساگ خوش ہو کے کھاتا نہیں وہ
منوہر تو ہے ہمسکراتا نہیں وہ!
مکمل کبھی ہاتھ آتا نہیں وہ!
کسی چیز سے روح رغبت نہ رکھے!

نہ پھولوں کو دیکھے!

نہ میوؤں کو چکھے!

گداز اس کی دھڑکن میں بولے تو کیسے!
کہ ابیات باہو کے گاتا نہیں وہ!
نہ پھیلا عبث اپنی جھولی کو بھولی!
تراشے ہوئے سنک ابیض کے آگے
سمٹتا نہیں وہ..... سماتا نہیں وہ!
تو پیاری سہیلی اسے ہاں نہ کہنا

کنواری ہی رہنا!

وہ آئے اور اس کم سخن کے لیے تو

ٹرائی سے پیالی میں چائے بنائے

سموے کھائے

جوار اور جو اور کمی کے دانے

مشینوں میں چھانے

بھنے اور بھنائے

مگر وہ

نہ دیکھے نہ کھائے

کوئی روزمرہ کا اخبار لے کر

سیاسی مسائل کے افکار لے کر

معاشی وسائل کے انبار لے کر

ترے نرم صوفے میں دھم ڈوب جائے

(کمر تا قدم۔ کم سے کم۔ ڈوب جائے)

وہ خود ڈوب جائے تو اس کی بلا سے

عرب ڈوب جائے عجم ڈوب جائے

تو اے جان..... اے میری معصوم روزی!

یہ سمجھو کہ ہے کوئی مصروف بندہ

امیر ریاست

وزیر وزارت

شہر سیاست

خطر خطابت

مدیر صحافت

مشیر مشقت

نفیر ثقافت

حجیر حجامت



کسی محکمے کا دہر و سکر

بہتر تہتر

کوئی رکن ایوان بالائے ملی

کہ چوہوں میں ملی

کوئی پشت ور پشت ممتاز شہری

طبیعت کا لہری

کوئی لکھ پتی سیٹھ.....صابون والا

کہ دھن بھی ہے کالا تو دل بھی ہے کالا

نہیں تر نوالہ

کوئی زر نوالہ

تو اے جان: اے میری معصوم روزی!

یہ تم جان لینا

کہ وہ ہے مفکر ہنسن ور

خود اپنی تہوں کا نہفتہ شناور

خیالوں کا خلاق.....جذبوں کا داور

گھڑی میں پشین اور گھڑی میں پشاور

سما کا سمندر

خلا کا مسافر

وما دم قلندر

تو اے جان اے میری معصوم روزی!

اے ہاں نہ کہنا

کنواری ہی رہنا..... (انگریزی سے)

All rights reserved

©2002-2006

کالے چھپرے کا مرثیہ

یہ نظم کراچی ہوا میدان کے قریب ہوائی جہازوں کے وسیع و عریض پہنی
اصطبل کے مسار کیے جانے پر لکھی گئی۔

یہ بلند و بالا ڈھانچا جو عرف عام میں ”کالا چھپرا“ کہلاتا تھا، کراچی کی
شاہراہ پر ایک معروف نشان راہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ 1965ء میں
میریے مکرم دوست کرل مقبول الہی درویش نے وزارت دفاع کے
فیصلے کے مطابق اس کو نیلام کیا۔ جن دنوں اس چھپر کی پہنی چٹری
ادھیڑی جاری تھی راقم الحروف ڈرگ روڈ چھاؤنی میں اس کے سایہ
حافظت میں رہتا تھا۔ (ض)

کالے چھپرے کی جوکل جامعہ دری ہونے لگی
جعفری کے گھر کے آگے ”جا فری“ ہونے لگی
برہمی سے شاعری میں نغمگی ہونے لگی
یعنی اس لوہے سے یہ چاندی کھری ہونے لگی
اس طرف چھپر کا اک اک تار جاں بجنے لگا
اس طرف نغموں سے شاعر کا مکاں بجنے لگا
آہ وہ ’چھپرا‘..... کراچی کا پرانا مہرباں
شہر کا مکھڑا..... سواد شہر کا قومی نشاں
سندھ میں سابق فصیل کشور ہندوستان
آہن و فولاد میں انگریز کا ’چنگیز خاں‘
شام کے صحرا میں وہ گویا چراغ شام تھا
شہر اپنا مصر تھا وہ مصر کا اہرام تھا
وہ جہازوں کا دلیل راہ بلکہ سربراہ

آہ وہ ”پی آئی اے“ کی ”ہائی وے“ کا بادشاہ
کس کو جکشتائی سے ڈھونڈے گی مسافر کی نگاہ
کون ہوگا اب کراچی کی حقیقت پر گواہ
پائیں گی اب کس کی دیواروں کے سائے میں اماں
ادھ بسی آبادیوں کی گائیں بھینسیں بکریاں
قیمتی لوہے کا زنگ آلودہ مینار بلند
قصر قیصر بے ضیا سلطان جابر درد مند
کھویا کھویا، سوپا، سوپا، روپا، روپا، بند بند
اپنی اردو شاعری کی طرح طبعاً غم پسند
ظرف عالی سے تہی آغوش بھی خاموش تھا
فقرو استغنا میں اک درویش کبل پوش تھا
”کالا چھپرا“ اب چھپرکھٹ سے نکالا جائے گا
جو سنبھلنے میں نہ آیا تھا..... سنبھالا جائے گا
بیچ، پیانوں میں..... پر پرزوں میں ڈھالا جائے گا
آنے والا آئے گا، اور جانے والا جائے گا
زندگی..... اک ہاتھ آگے کانپتا بلور ہے
آدمی..... دو گام پیچھے ہانپتا مزدور ہے

بنگلے کا ڈھانچا

راقم الحروف کو ملازمت کے دوران میں کچھ عرصہ راولپنڈی میں ریس کورس کے نواح میں ایک عارضی چوہی گھروندے (HUT) میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس گھروندے کا منظوم احوال ایک نظم میں جو ضمیر کا گھر کے عنوان سے میرے مجموعہ کلام 'مافی الضمیر' میں شامل ہے بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم کی پیش کش کے بعد ارباب اختیار کی طرف سے ہمیں جس بنگلے سے نوازا گیا اس کی جھلک ذیل کے اشعار میں پیش کی گئی ہے۔ (ضمیر)

ٹین کے چھجوں سے دو کمرے میں بنگائے ہوئے
جیسے انڈوں پر ہوں پر مرغی نے پھیلانے ہوئے
اک کھلا دہ ہے جو کھلتا ہے کھلے میدان میں
گھر میں بھی رہتا ہوں پوری قوم کے گھمسان میں
پردہ دیوار تاحد نظر..... کچھ بھی نہیں
زیست اس منزل میں جز ذوق سفر..... کچھ بھی نہیں
کھیلتے ہیں گیند بلا بھی یہیں مردانہ وار
لال کرتی کے حنیف و امتیاز و کاردار
دیدنی ہوتا ہے منظر ضرب تند و تیز پر
"فیلڈر" میرے کچن میں گیند میری میز پر
ماؤں بہنوں بیٹیوں کی طرح پھرتی ہیں یہاں
چھاؤنی بھر کی سہاگن گائیں بھینسیں بکریاں
ماجرا کیسے کہوں دیوار و در کے رنگ کا

منہ کو آہنچا کلیجہ چوب و خشت و سنگ کا
یہ مکاں 'یہ مغربی تہذیب کا لخت جگر
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر
ہم سے پہلے جن کے زیرِ پاتھی یہ 'خلد بریں'
وہ نکل جانے پہ بھی پوری طرح نکلے نہیں
اس کی دیواروں پہ مرخے ہیں 'کواڑوں پر حساب
لکھ گئے ہیں ان کے بچے سب سوالوں کے جواب
چپا چپا اس مکاں کے استخوانِ پیر کا
نقشِ فریادی کسی کی کانپتی تعمیر کا

نورن کے نام

(شملے سے ایک خط)

شملے کے مناظر دیکھ ذرا ہر چیز ہے ناہموار یہاں
ہر وضع کا سنت مہنت یہاں، ہر قطع کا دنیا دار یہاں
انسان یہاں، ننگور یہاں، انگیز یہاں، سرکار یہاں
اونچے اونچے دیودار یہاں، ٹیڑھے میڑھے بازار یہاں
نورن! میری پیاری نورن آتو بھی کبھی اک بار یہاں
تو آئے تو اس کانگری کی نئی نئی باتیں دیکھے
دھندلے دھندلے سے دن دیکھے روشن راتیں دیکھے
ہر باسی تازے چہرے پر غازے کی کراماتیں دیکھے
جاگی..... چت لاگی راتوں میں من موہن کاروبار یہاں
نورن! میری پیار نورن آتو بھی کبھی اک بار یہاں
کب اپنے منڈی میلے میں شملے کی 'مال' کے نظارے
انگریز کی خوش بختی، خوش وقتی اور اقبال کے نظارے
کجرات کی مدھ ماتی آنکھیں، زلف بنگال کے نظارے
پنجاب کے کڑیل مرد یہاں، دکن کی سلونی نار یہاں
نورن! میری پیاری نورن آتو بھی کبھی اک بار یہاں
اڑتی ہوئی برف کے ریشم پر یہ روپ سروپ اجالوں کے
چلتے ہوئے جادو نظروں کے پتے ہوئے تختے گالوں کے
چاندی کی چمک میں مدھم مدھم چہرے رکشا والوں کے،
رکشا کے اندر ایک یہاں، رکشا کے باہر چار یہاں
نورن میری پیاری نورن! آتو بھی کبھی اک بار یہاں

ہر رام سرن، ہر رام چرن، ہر دریو دھن ہے شملے میں
دلی کا ہر اک اونچا صاحب، مع میم مٹن ہے شملے میں
پنجاب سے بھی اک آدھ وزیر خوش اچکن، ہے شملے میں
سجے ہیں بھرے بازار یہاں، لگتے ہیں بڑے دربار یہاں
نورن میری پیاری نورن آ تو بھی کبھی اک بار یہاں
ٹاٹوں سے نکل کر دیکھ کبھی تو بھی ”سٹنٹاٹوں“ کی بستی
یہ کھیل تماشوں کا میلان، یہ سیر سپاٹوں کی بستی
دیسی سٹراٹوں کا رمنا، افزنگی لاٹوں کی بستی!
ہر شام ہے شام بہار یہاں، ہر رات شب بیدار یہاں
نورن میری پیاری نورن! آ تو بھی کبھی اک بار یہاں

دارالسلام۔ (ٹوٹی کنڈی)..... 1943ء

الو اور بلبل

وانا ہی سہی
الو سے نہ رائے مانگ کبھی.....
سننی ہے تو سن.....
من بانی..... شاخ پہ جھوٹی گاتی بلبل کی
یا..... سبزہ و گل میں گھلتی ہوئی
اور کھلی ہوئی
ست رنگ پروں کی لالی سے
اس بے فکری دیوانی سے
مستانی کلنی والی سے
تجھے آس ملے
تری پیاس بجھے
تسکین سرور، مٹھاس ملے
جیسے شاعر کے بول کہ من میں جا اتریں
اور رور کتھا پر چارک کی

(انگریز شاعر آسٹن سے ماخوذ)..... 8 جولائی 1982ء

الوداع دندان ما

ذیل کے اشعار برزخ کے اس عرصے میں لکھے گئے جب اصلی دانت
نکلوائے جا چکے تھے اور مصنوعی دانت لگائے نہیں گئے تھے۔ (ض)

رخصت اے مرے اصلی دانتو!
اصلی اصلی، اصلی، نسلی دانتو!
اے میری سابق بیتیسی
ساتھ برس تک چکی پیسی
کلچے، تکیے، آلو، چھوٹے
گنے، گندے، سخت اور پوٹے
موٹھ، مرٹڈے، مرغی دانے
لڈو، پیڑے، مٹر، مکھانے
پان، پروسے، چاٹ، کھلائی
ہر موسم کی چوگ چگائی
روٹی، بوٹی، مرغ، پلا
سر، بکرے کا، دھچ، گاؤ
رے، کالے، ڈنھل، توڑے
دانت، درانتی، دانت، ہتھوڑے
لوہا، پتھر، سخت، نوالہ
کٹ، کٹ، کترا، منہ میں ڈالا
قصر، شکم کی ڈیوٹی، کرنا
خالی کرنا اور پھر بھرنا

بند دوراڑیں 'تیز' کٹاری

منہ پھاٹک کی چوکیداری

وائیں بائیں..... ہنے والی

ظاہر سالم 'باطن' خالی

جیسے جادو گر کی تھالی

وائے غفلت 'اف' نادانی

کارگروں کی قدر نہ جانی

اٹھے بیٹھے 'جاگے' سوئے

داڑھ نہ ماخھی 'دانت' نہ دھوئے

دانتوں سے تھی شوبھا ساری

بجھ گئی چہرے کی پھلواڑی

لوگ کرے ہیں کانا پھوسی

دیکھو آم کی گٹھلی چوسی

شکل ہوئی جاپانی اپنی

ہنسی لگے کھسیانی اپنی

بابا بابا کہہ کے پکاریں

'کڑیاں' کیا..... پختہ مٹیاں

کون اب بیٹھے 'کول' ہمارے

'بچ' بولو تو چوک بہت ہو

'تھے' میں 'تھ' کم 'تھوک' بہت ہو

'ب' میں کوئی 'بندوق' چلے ہیں

'ک' میں لمبی 'ہوک' چلے ہیں

مسند شعر پہ آتو براجے
 دانت بنا اب تانت نہ باجے
 گیا ترنم کا وہ افسوں
 شعر پڑھوں تو شش‌شرشوں شوں
 پیاس لگی تو شاعر بولا
 لکولکول کوکا کولا
 ہم بولے..... ”چائے“ بیگم
 بیگم بولی..... ”ہائے“
 ہم نے کہا..... ”رومال“ اٹھاؤ
 بیگم بولی..... ”دال“ پکاؤ؟
 کچھ اعضا..... منہ زور بہت تھے
 جسم کے اندر چور بہت تھے

.....

دادا جان

اپنے تنہا کمرے میں
دل ویران..... نظر سنان
وہ بیٹھے ہیں دادا جانب

اک سیاست دان
اک جریدے کے ایڈیٹر سے کہا
آپ کے اخبار نے لکھا کہ
اپنے پیندے پر کھڑا رہتا نہیں
اپنی رائے بر ملا کہتا نہیں
اس لئے خوش حال ہوں
کیوں کہ بازار سیاست کا بکاؤ مال ہوں
سن کے یہ شکوہ..... ایڈیٹر نے کہا
ہے عبث مجھ سے گلہ
یہ پھٹپھٹ چیتھڑا ہوگا کوئی
میرے پرچے میں کوئی باسی خبر چھپتی نہیں

(انگریزی سے) 1983ء



ہم 'نیوٹرل' ہیں خارجہ حکمت کے باب میں
”نے ہاتھ باگ پر ہیں نہ پاپیں رکاب میں“
یوں کانپتا ہے شیخ خیال شراب سے
جیسے کبھی یہ ڈوب گیا تھا شراب میں
اس بات پر بھی ہم نے کئی باب لکھ دیئے
جو بات رہ گئی تھی خدا کی کتاب میں
تنقید جامِ وے تو بہت ہو چکی حضور
اب کیا خیال ہے غم ہستی کے باب میں؟
رندوں کی بے ہستی بھی خبردار چیز تھی
اکثر جھگڑ پڑے ہیں حساب و کتاب میں
لطف اس مشاعرے میں ملا کاک ٹیل کا
جمنہ کا رس بھی آن ملا ہے چناب میں

یہ اشعار 1953ء میں گارڈن کالج راولپنڈی کے جشنِ طلائی کے
مشاعرہ کے لئے کہے گئے۔ اس مشاعرے میں ہندوستان سے اردو
کے بزرگ شاعر پنڈت تلوک چند محروم اور ان کے سہتر نامور شاعر
پروفیسر جگن ناتھ آزاد شریک تھے۔

شوہر فریادی

کرلی شادی

قید کڑی اور بے معیادی
ختم ہوا سب دھوم دھڑکا
آدم زادہ ہکا بکا
سلب ہوئی ساری آزادی
اکثر تو لے چپ چپ رہتا ہے
کہتا ہے تو یہ کہتا ہے
بیوی سے شوہر فریادی

انت مولا..... انت ہادی

ہم روتے ہیں

(بنگل کے گورنر ”ہالی ڈے“ کے بارے میں)

جب ہالی ڈے آتا ہے
تو چین ہمارا جاتا ہے
جنگل میں منگل ہوتا ہے

کھیل تماشے
ڈھولک تماشے
کپ میں سب کچھ ہوتا ہے
ہالی ڈے سوتا ہے
معتبرین

پہنے اپنی دیسی ’جین‘

آتے ہیں

پھولوں میں ہار پروتے ہیں

وہ ہنتے ہیں

ہم روتے ہیں

(بگ ہولڈن).....1853ء

غروب آفتاب کے بعد

گیا میں اتفاقاً کل جو ایک تصویر خانے میں
تو سرہریٹ ایمرسن، مل گئے کل چار آنے میں
وہی تصویر جو پہلے بہ حرمت کام آتی تھی
کچھری میں، کلنڈر میں، شفا خانے میں، تھانے میں
کہیں، مسرور، موتی چور ایوانوں کی زینت تھی
کہیں یہ لازمی تھی دفنوں کے دفنانے میں
وہی اب تنگ رہی تھی اک کباڑی کے درتچے پر
وہی اب بک رہی تھی اور بہ منت، چار آنے میں

(مری).....1948ء

سرہریٹ ایمرسن: صوبہ پنجاب کا ایک انگریز گورنر



سوز غم، جوش جنوں، عشق بتاں رہنے دیا
یعنی دل میں اک نہ اک چنگیز خان رہنے دیا
مدرسوں میں بند کر کے حلقہ ارباب ذوق
مطبخوں میں حلقہ باورچیاں رہنے دیا
ایشیا کے مطمئن بندوں کی یارب داد دے
ابر کو ابر..... آسماں کو آسماں رہنے دیا
ایسی نازک پرورش، اتنی ملامت تربیت
ہم نے شاہیں میں کبوتر بھی کہاں رہنے دیا
اب وہ حسرت ہو کر حیرت ہو کر عبرت ہو ضمیر
ہم وہیں رہنے لگے اس نے جہاں رہنے دیا

.....1963ء

اودیس سے آنے والے بتا!

(شاعر رومان حضرت اختر شیرانی کی ایک مقبول نظم کی تقلید میں - ضمیر)

اودیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یاران وطن!
کیا اب بھی وہی دوشنبے کو راشن کے ذخیرے کھاتے ہیں
مٹی کے مرکب، گندم کیا سونے کے برابر تلتے ہیں
دو چٹکی چاول کی خاطر چھ چھ دن رتے گھلتے ہیں
پتلے فضل الدینان وطن، موٹے، بدری ناتھان وطن،
اودیس سے آنے والے بتا

کس حال میں ہیں یاران وطن!
کیا مہر بہ درتہ خانوں میں ہیں نبیوں کے گودام اب بھی
من میں ہے لو بھ کی چاہ وہی اور لوٹ کھسوٹ ہے عام اب بھی!
لڑتا ہے کسانوں کی خاطر چھوٹا سا 'چھوٹو رام' اب بھی!
اس جاٹ سے کیا دیتے ہیں ابھی وہ 'لالہ رخ لالان وطن'
اودیس سے آنے والے بتا

کس حال میں ہیں یاران وطن!
اب بھی جنگی مہنگائی سے مخلوص خدا بے تاب سی ہے!
ہر کالی رات غریبوں کی، بے چین سی ہے، بے خواب سی ہے!
تمباکوک بھی ناپید سا ہے اور ماچس بھی نایاب سی ہے!
اور حقہ پینا فرض وطن، ہاں دین وطن، ایمان وطن
اودیس سے آنے والے بتا

کس حال میں ہیں یاران وطن!
کچھ گاؤں کی باتیں، کیا اب بھی منگلا پر بادل چھاتا ہے؟
روہتاس میں بیساکھی رت میں میلا اب بھی بھر جاتا ہے؟
بصرے اور سنگاپور سے پلٹن والوں کا خط آتا ہے؟
وہ کھیت میں رستم خان وطن اور گھر میں ”ریشم جان وطن“؟

(شملہ).....1942ء

متحدہ پنجاب میں ہر سکندر حیات کی کاہینہ کے وزیر چودھری سرچھوٹو رام
جو کسانوں کے ہمدرد تھے۔
2۔ دوسری جنگ عالمگیر۔

©2002-2006

چوری کا مال

اک مرد مجروح کے گھر سے
چوروں کے ہاتھ جو مال آیا
اس مال کو دیکھ کے
بیباہ ہوؤں کو حال آیا
رنگین، بلاؤں، جاپانی
مکے..... ورتے، بورتے
کچھ شب
کچھ نیم © 2002-2006
جن سے جھلکے گوری کا بدن
آویزے..... فرغل..... بال
اودے اودے، دھانی دھانی
اس مرد مجروح کے گھر سے
ہر شے نکلی..... نامردانی

.....1982ء

ایک آرزو

کاش ان سے یوں ملاقاتیں کریں
کلبلاقی ہیں جو دل میں صبح و شام
کھول کر دل پیار کی باتیں کریں
شب کی چلن صبح تک جاگی رہے

صبحوں کو
زلفوں کی چادر ڈال کر راتیں بسر کریں

ہوں نہ اپنے درمیاں

یہ زمین و آسمان

کوئی شے باہر نہ ہو، اندر نہ ہو
چپ رہے اس کی کلائی کی گھڑی
اور دیواروں پر کیلنڈر نہ ہو

گیلا چیک

ایک بنک میں ایک بیاہی عورت
'چیک' لائی کیش کرانے کو

'چیک' گیا تھا

نم دیدہ..... نیلا نیلا تھا

بابو نے جو اس کا سبب پوچھا

عورت بولی

مرے شوہر نے جب 'چیک' لکھا

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے

(انگریزی سے ماخوذ)..... مسقط-20 اگست 1983ء

ختم شد-----The End